انتظار حسین کی ناول نگاری......ایک جائزہ

ڈاکٹر ثمینہ افتخار، سینئر ایڈیٹر، شعبۂ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Abstract

The subject of matter of Intazar Hussain's novels, on one hand is partition of India, sectarian riots and islamic history. On the other hand his novels take into account the withering out feudal system, dying moral values and decaying old towers of rituals.

قیامِ پاکستان کے بعد جن افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے اردو افسانہ اور ناول کی تاریخ میں خوبصورت اضافے کیے ہیں ان میں انتظار حسین کا نام سرفہرست ہے۔ داستان اور کتھا سے لے کر مابعد جدید رویے کی علامتی کہانی تک انھوں نے اپنے افسانوی ادب میں نت نئے انداز اختیار کیے ہیں کہ ان کو پڑھنا دراصل کہانی کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی حاصل کرنا ہے۔ ان کی تحریروں میں ماضی کی یاد بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ شناخت سے محرومی کی تکلیف ان کو پرانی تہذیب اور اساطیر کے مطالعے کی طرف لے گئی ہے اور اس مطالعے کی پیش کش سے انھوں نے ان کے باطن کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تحریروں میں داستانیں، تاریخی واقعات، حالات حاضرہ کی کشمکش، رومانی وتہذیبی بے اطمینانی کی ملی جلی کیفیات ملتی ہیں۔ وہ ہمیں ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں لے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں ہجرت کا دکھ بھی نمایاں نظر آیا ہے۔ یہ ہجرت ان کے لیے تخلیقی تجربہ بن گئی ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کی تحریروں میں تشخص کا بحران، تہذیبی وثقافتی یلغار انفرادی واجتماعی زوال نظر آتا ہے۔

انتظار حسین کے ناول کی تعداد چار ہے:

(i) چاند گہن (۱۹۵۳ء)

(ii) بستی (۱۹۸۰ء)

(iii) تذکرہ (۱۹۸۷ء)

(iv) آگے سمندر ہے (۱۹۹۵ء)

چاند گہن (۱۹۵۳ء):

انتظار حسین کے اس ناول کا موضوع ہندوستان کی تقسیم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جملہ مسائل کو انسانی جذبات و احساسات کی سطح پر دکھانے اور سمجھانے کی ایک کوشش ہے جن کے سبب برصغیر کے مسلمانوں کو ایک بڑے پُر آشوب دور سے گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری لکھتے ہیں:

''مصنف نے (انتظار حسین نے) ایک ناول چاند گہن لکھا ہے جس کا موضوع تقسیم ہندوستان ہے۔ انھوں نے یہ دکھایا ہے کہ اس تقسیم سے ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا قیامت بیت گئی۔''(۱)

ناول نگار اپنے موضوع کو فکری پس منظر میں پیش کرتا ہے۔ اس حوالے سے ہم واقعہ کربلا اور عہد نامہ عتیق اور ۱۸۵۷ء کے پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے چاند کے گہنانے کے عمل کو بھی پیش نظر رکھیں گے کیوں کہ یہی وہ لفظ ہے جو تاریخ میں وقوع پذیر ہونے والے مختلف واقعات سے اپنا ایک معنوی ربط قائم کیے ہوئے ہے۔ واقعہ کربلا کے فکری پس منظر میں ایک بڑے سانحاتی والمیاتی واقعے کی مختصر روداد اس ناول میں کچھ اس طرح نظر آتی ہے:

''امام ہمام جب بعد زوال زمین تشریف لائے تو شمر خنجر بکف سینہ بے کینہ امام پر چڑھا اور اس بے ادبی کا مرتکب ہوا کہ زمین کربلا لرز گئی... بعد شہادت زمین کو زلزلہ آیا اور آسمان سے خون برسا اور ایک سیاہ آندھی اٹھی اور آفتاب کو گہن لگا اور منادی نے ندا کی کہ قتل الحسین بہ کربلا زبیح الحسین بہ کربلا راویوں نے یوں بھی لکھا ہے کہ اس رات چاند کو گہن لگا سارا چاند گہنا گیا۔''(۲)

اگر عہد نامہ عتیق کے فکری پس منظر میں دیکھیں تو اس ناول میں اس کا حوالہ کچھ یوں ملتا ہے:

''فضا میں ایک گرجدار آواز گونجی 'گر پڑا بڑا شہر گر پڑا' کسی نامعلوم سمت سے کسی کے نوحہ کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ اے بڑے شہر اے بستیوں کی ملکہ۔ افسوس۔ افسوس۔ افسوس۔''(۳)

اس بربادی سے قبل چاند کی کیفیت کو انتظار حسین بیان کرتے ہیں:

''چاند پر ایک کرب کی کیفیت طاری تھی سرخی پھیلتی گئی گہری ہوتی گئی۔ سرخی اور پھیلی... گہری ہوئی.. آدھا چاند سرخ ہو گیا۔ آگ کے انگارے کی طرح دہکنے لگا، تلوار کے گھاؤ کی طرح خوناخون ہو گیا۔''(۴)

ناول کے موضوع کی تفہیم کی غرض سے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے حوالے سے مصنف لکھتے ہیں:

''اللہ ہر کربلا سے محفوظ رکھے.... غدر کے دنوں میں ایسا گہن پڑا تھا کہ سارا چاند ڈوب گیا۔''(۵)

ان تمام حوالوں میں جو قدر مشترک ہے وہ چاند کا گہنانا ہے۔ ناول نگار نے اس کا اطلاق ماضی بعید یا ماضی قریب میں کسی بھی رونما ہونے والے سانحاتی والمیاتی واقعے سے اس لیے کیا ہے کہ اس کے ہاں ہندوستان اور پاکستان کی تقسیم بھی ایک بڑے سانحاتی واقعے کی صورت متشکل ہوتی ہے:

''نمبر دانی صاحب سنیں ہیں کہ اس جمعرات کو گرہن پڑے گا۔''(۶)

''آج شام کو جب میں چتلی قبر سے گزر رہا تھا ایک فقیر کو دیکھا میلے کچیلے پھٹے کپڑے... پیغمبرانہ انداز میں اعلان کرتا چلا جاتا تھا کہ چاند گرہن پڑے گا۔ دان دو... معلوم نہیں یہ فقیر کون سے گرہن کا ذکر کرتا تھا۔ چاند گرہن تو پڑ رہا ہے۔ امرتسر سے کلکتہ تک مجھے گہن ہی گہن نظر آتا ہے۔''(۷)

ناول کا موضوع فسادات سے پہلے کی مجموعی گھمبیر فضا، فسادات، ہجرت اور پاکستان آمد کے بعد درپیش جملہ جذباتی ونفسیاتی مسائل ہیں۔

گوپی چند نارنگ کے بقول:

''چاند گہن کے تین حصّے ہیں تقسیم سے پہلے کی غیر یقینی صورت حال، فسادات اور آزادی کے بعد کی فضا۔''(۸)

انتظار حسین کا یہ ناول ابتداء میں تقسیم سے قبل کی فضا پیش کرتا ہے، جس سے حسن پور کی بستی اور اس کے مکینوں کے ذہنی رویوں اور ان کی عادات واطوار سے شناسائی ہوتی ہے۔ ناول نگار نے حسن پور کے جس گھرانے کو موضوع بنایا ہے اس کے افراد خانہ میں بالخصوص سبطین بو جی اور گلشن شامل ہیں۔ قصے کے آغاز میں سبطین کی والدہ بو جی ایک ڈروانے خواب سے خوفزدہ ہو کر اُٹھتی ہیں تو انھیں مختلف اوہام وخدشات گھیر لیتے ہیں اور دُر بلا کی غرض سے گھر پر محلے کی خواتین کے ساتھ مل کر ایک مجلس کا اہتمام کرتی ہیں۔ دوسری طرف حسن پور کے بازار میں علن پنواڑی کی دکان ہے جہاں ہمہ وقت لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے جو نہ صرف حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں بلکہ پیش آئند واقعات پر بھی اپنی اپنی ذہنی استعداد کے مطابق خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں رضیا، کالے خان اور شیر و پلے دار شامل ہیں۔

سبطین بو جی کا اکلوتا بیٹا ہے۔ قوم کی مجموعی زبوں حالی کا دکھ درد دل میں محسوس کرتے ہوئے وہ پروفیسری سے صحافت تک اک جہد مسلسل میں مشغول ومصروف رہتا ہے۔ عوام تک اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے بڑی شدومد سے ایک اخبار کا اجراء کرتا ہے۔ لیکن اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ مسلمان قوم کی بے حسی اور عدم دلچسپی کو شدت سے محسوس کرتا ہے:

''آخر مولانا محمد علی کے زمانے کے مسلمان کیا ہوئے۔''(۹)

سبطین کا دوست فیاض خاں ملک کے طول وعرض میں اپنا اصلاحی پیغام پہنچانے کے لیے گھومتا پھرتا ہے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ حالات سے مایوس ہو کر وہ دلی چلا جاتا ہے مگر وہاں کے دگرگوں حالات دیکھ کر اپنی ڈائری میں نوحہ دلی مرحوم رقم کرتا ہے:

''کیا یہ وہی دلی تھی جسے شاہجہاں نے آباد کیا تھا اور کیا یہ وہی دلی ہے جس کی سڑکیں آج سے سو سال پہلے بخت خاں کے گھوڑے کی ٹاپوں سے گونج اٹھتی تھیں شاہجہاں اور اورنگ زیب تو دنیا

سے اٹھ ہی گئے لیکن کیا کوئی بخت خاں بھی اب باقی نہیں ہے۔''(۱۰)

ہندوستان کی تقسیم کے فسادات کے تباہ کن کھیل کے آغاز کے ساتھ ہی کچھ لوگ اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ ان میں فضل حق وکیل اور نمبردار صاحب بھی شامل ہیں جن کی تمام تر جذباتی وابستگیاں مسلمانوں اور مسلم لیگ کے لیے وقف ہیں تاہم ممکنہ خطرات کے پیش نظر یہ مسلم لیگ کو چھوڑ کر، گاندھی جی کی انسانی دوستی، پنڈت جواہر لال نہرو کی آزاد خیالی اور ابوالکلام آزاد کی علمیت کا دم بھرنے لگتے ہیں اور لالہ رگھو بردیال بزاز کی دکان پر بیٹھ کر اپنے خیالات کی تشہیر شروع کر دیتے ہیں:

''کوئی بھلا مانس ہوتا تو ان کے قلب ماہیت کی قدر کرتا اور انھیں سینے سے لگا لیتا لیکن لالہ رگھو بردیال بزاز ٹس سے مس نہ ہوئے اور نہ ان کی دکان پر بیٹھنے والے دوسرے لوگوں نے ان کی باتوں پر توجہ دی۔''(۱۱)

ملک میں ہونے والے فسادات کی وجہ سے حسن پور کے مکینوں پر بھی افسردگی چھائی ہوتی ہے۔ ان کے دلوں میں موجود خوف و ہراس ان پر اس وقت پوری طرح حاوی ہو جاتا ہے جب افسری فاطمہ عرف فرو کو ٹھے والی کے شوہر کا قتل ہوتا ہے۔ پھر حالات میں بتدریج بگاڑ پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ لوگوں کے درمیان نفاق اور نفرت کا بیج نمو پا کر ایک تن آور درخت بن جاتا ہے۔ رواداری، خلوص و ایثار کے جذبات قومی تعصّبات کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ ایسے میں فیاض خاں جیسا بیباک اور نڈر شخص بھی فسادات کی ہولناکیوں اور خوں ریزیوں کے باعث خود کو خوف و ہراس کی طنابوں میں جکڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ چناں چہ وہ اپنی ڈائری میں اپنے باطنی کرب کا اظہار تاثراتی سطح پر کچھ اس طرح کرتا ہے:

''میرے ذہن کی رگیں ٹوٹی جا رہی تھیں۔ بس یوں جی چاہتا ہے کہ کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جاؤں اور کسی ایسی سڑک پر پہنچوں جہاں ہر طرف خون ہو، لاشیں ہوں اور چیخ و پکار ہو۔''(۱۲)

فسادات کے دوران فیاض خاں دلی میں موجود ہوتا ہے۔ دلی کی خونچکاں فضا، عوام کی بے کسی و بے بسی، حالات کی سفاکی اور دہشت کو اپنی ڈائری میں رقم کرتا چلا جاتا ہے۔ بگڑتے ہوئے پراگندہ حالات کے سبب ملک کے دیگر حصوں کی طرح حسن پور کے باسیوں کے مقدر میں ہجرت کرنا لکھ دیا جاتا ہے۔ سبطین، فیاض خاں، علن پنواڑی، رضیا، حق صاحب، نمبردار، کالے خاں وغیرہ نہایت ڈرامائی انداز میں ریل کے ڈبہ میں باہم ملتے ہیں۔ یہیں پر شیر و پلہ دار کی موت کا انکشاف ہوتا ہے جس پر تمام لوگ افسردہ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی لغویت اور بے مقصدیت کا احساس شدت سے ان کے ذہن میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ ریل کے ڈبے میں ہی افسری فاطمہ فیاض خاں کی نظر عنایت کی طلب گار بن جاتی ہے مگر وہ اس سے بے اعتنائی برتتا ہے مگر فضل حق وکیل یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور اس کی طرف ملتفت ہو جاتا ہے۔

آخر کار ٹرین پاکستان کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے تو تمام مسافر سکھ کا سانس لیتے ہیں لیکن پاکستان میں

آنے کے بعد روز وشب کے مسائل میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ ایسے میں فضل حق جیسا ابن الوقت اپنے لیے کارخانہ ہتھیانے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر علن پنواڑی، سبطین اور فیاض خاں وقت کی چکی میں پس جاتے ہیں۔

چاند گہن میں انتظار حسین ایک غیر جانبدار ناظر کی طرح انسانی بربریت اور بہمیت کی کارگزاریوں پر نظر دوڑاتے ہوئے سستی اور سطحی جذباتیت کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ خود انسانی باطن کے بھیانک روپ کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں:

> ''میرے لیے یہ پورا واقعہ (فسادات کا) جو تھا ایک پیچ در پیچ انسانی المیہ تھا۔ یعنی میرے ہاں کچھ اور قسم کے سوالات اور شک پیدا ہو رہے تھے... اب میں سوچ رہا، حیران ہو رہا تھا کہ اس تہذیب میں سے یہ جو نیا آدمی نکلا ہے یہ اس کی کیا شکل ہے جو ۱۹۴۷ء میں نظر آ رہی ہے۔'' (۱۳)

ناول نگار کے نزدیک ہجرت باطنی سطح پر ایک تہذیب کی ویرانی کا نوحہ ہے جہاں انسانی قدریں، خیالات وافکار اور زندگی کے بڑے آدرش خاک راہ ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی منطق کوئی دلیل کام نہیں آتی اور لوگ زندگی کے تمام اصول وضوابط بھول بھال کر ذاتی اغراض ومقاصد میں بدمست ہو جاتے ہیں جس کے سبب حساس طبیعت کے مالک ملک وقوم کے خیر خواہ اور صحیح معنوں میں باعمل زندگی گزارنے والے لوگ بہت سے نفسیاتی مسائل، ذہنی الجھنوں میں گھر کر رہ جاتے ہیں کیوں کہ یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ لوگ کیسے اور کیوں کر تقسیم فسادات اور ہجرت کے واقعات پلک جھپکنے میں بھول گئے ہیں:

> ''تجربے قومیں ضائع بھی کر دیا کرتی ہیں اور قومیں اپنی تاریخ کو بھول بھی جایا کرتی تھیں.... اس طرح کے دور بھی آتے ہیں کہ پوری تاریخ گم ہو جاتی ہے تو یہ ہجرت کا جو تجربہ ہے میں اب ایک مایوسی آپ اسے سمجھ لیں ایک قنوطیت کہہ لیں۔ یہ عرض کروں گا کہ یہ تجربہ ضائع ہو چکا ہے۔'' (۱۴)

فکری اعتبار سے ناول کا پلاٹ واقعات کی پیش کش اور بندش کے حوالے سے مربوط نظر آتا ہے مگر فنی اعتبار سے اس میں کہیں کہیں جھول نظر آتا ہے کیوں کہ ناول نگار کا قصے کی تعمیر میں بار بار مداخلت کرنا اور قاری کو ذاتی آراء سے نوازنا کسی حد تک فنی نقص کا باعث بنتا ہے۔ بقول رضی عابدی:

> ''مصنف بار بار کہانی کے دوران سامنے آ کر حالات اور واقعات پر تبصرے بھی کرتا جاتا ہے۔ یہ ناول کی ایک بڑی فنی کمزوری ہے... یوں ایک ناول کی فنی وحدت مجروح ہوتی ہے... جس کی وجہ سے یہ نیم افسانوی، نیم انشائیے، نیم تخلیقی، نیم واعظانہ قسم کی چیز بن جاتا ہے اور اس طرح ناول کی معروفیت (Objectivity) کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔'' (۱۵)

اس خامی کی وجہ سے اگر ''چاند گہن'' کا پلاٹ بھرپور اور کامیاب نہیں تو اسے بالکل ناکام پلاٹ تصور کرنا بھی درست نہیں ہے کیوں کہ پلاٹ کی سب سے بڑی خوبی واقعات کی ترتیب وتشکیل میں کہانی کا ارتقائی مراحل سے گزرنا اور پڑھنے والے کے لیے ایک جہانِ نو ثابت ہوتا ہے تو اس حوالے سے اس پلاٹ کو مربوط اور متاثر

کن پلاٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس ناول میں ڈائری اور کسی حد تک رپورتاژ کی تکنیک استعمال کی گئی ہے۔

''چاند گہن'' کی کردار نگاری کو سامنے رکھیں تو کوئی کردار مرکزی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ بہت سے کردار مل کر ناول کی مجموعی فضا تشکیل دیتے ہیں اور ذہنی، تہذیبی و سماجی سطح پر معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے ایسے ہزار ہا لوگوں کے نمائندہ بن جاتے جو معاشرتی تاروپود میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ناول نگار نے کمالِ مہارت سے اپنے ان کرداروں کی ذہنی سطح، مزاج، عادات واطوار، سماجی اور معاشرتی حیثیت کو سامنے رکھتے ہوئے ان سے گفتگو کرائی ہے۔ انتظار حسین کے اسلوب کی خاص بات جملوں میں لفظوں کی چست بندش ہے جس کے سبب ہمیں اکثر چھوٹے چھوٹے مگر مکمل معنویت کے حامل فقرے نظر آتے ہیں جن میں لفظوں کا صوتی آہنگ اور لہجے میں کھنک محسوس کی جا سکتی ہے۔ ''چاند گہن'' کے فکری وفنی جائزے کے بعد یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ناول نگار کی یہ کاوش غیر معمولی اہمیت اور انفرادیت کی حامل ہے۔

بستی (۱۹۸۰ء):

کتاب گھر، لاہور سے شائع ہوا۔ ہندی میں اس کا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں شائع ہو چکا ہے کولمبیا یونیورسٹی سے امریکن خاتون Frances, W. Prichett نے اس کا انگریزی ترجمہ "The Town" کے نام سے کیا جو Harper Collins Publishers نے شائع کیا۔

بستی کا بنیادی موضوع سقوط پاکستان سے پیدا ہونے والا المیہ ہے جو ناول نگار کے ہاں ایک بڑے سانحے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ آفتاب احمد لکھتے ہیں:

> ''بظاہر انتظار کے اس ناول کا موضوع مشرقی پاکستان کا المیہ ہے مگر دراصل یہ شکست وریخت کی ایک ایسی داستان ہے جس نے بستیوں، شہروں اور انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حالات وواقعات کا سیلاب ان سب کو اپنے ریلے میں بہالے جاتا ہے۔''(۱۶)

ناول کا دوسرا ضمنی موضوع ہجرت ہے۔ اگرچہ ناول میں ہجرت کی واقعاتی روداد سے گریز کیا گیا ہے۔ تاہم ہجرت قصے کی تعمیر، تفہیم اور بُنت میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے بلکہ کہانی دائرے کو مختلف واقعات اور جغرافیائی خطوں میں بانٹ دیا ہے۔

انتظار حسین کے نزدیک ہجرت کے معنی ہیں:

> ''اپنے وجود کے مرکز سے ہجرت کرنا اور وقت کے ایک آہنگ کی طرف سے دوسرے آہنگ کی طرف سفر کرنا۔''(۱۷)

انتظار حسین اس ناول میں ہجرت کے توسط سے ان تہذیبی قدروں کی بازیافت کی سعی کرتے ہیں جو نیرنگی زمانہ کے سبب پامال ہو گئی ہیں اور بعد از ہجرت لوگوں کو درپیش مسائل کا فنکارانہ چابک دستی سے احاطہ کرتے ہیں۔

اس ناول کی تلخیص درج ذیل ہے۔

ذاکر لاہور کے کسی کالج میں پروفیسر ہے۔ وہ سقوطِ ڈھاکہ سے قبل کی مکدر سیاسی، سماجی، تہذیبی انحطاط کی فضا سے دل گرفتہ ہے اور ماضی کی پناہ گاہ میں بار بار چھپنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی خوشگوار یادوں کا مرکز روپ نگر ہے۔ تقسیم سے قبل کی فضا میں فطرت اور انسان میں مغائرت کم نظر آتی ہے۔ ہندو مسلم تہذیب کی نمائندگی بھگت جی اور ذاکر کے والد ناصر علی کرتے ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار ذاکر اس باہم اختلاط پذیر معاشرے میں پروان چڑھتا ہے۔ روپ نگر میں بجلی کے کھمبے لگتے ہیں ایک نئے سماجی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ناصر علی مسجد میں بجلی لگنے کو بدعت خیال کرتے ہوئے اس کی بھرپور مخالفت کرتے ہیں مگر ان کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی اور انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے جس سے دلبرداشتہ ہو کر وہ گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس دوران روپ نگر میں طاعون کی وبا پھیل جاتی ہے۔ بہت سے لوگ نقل مکانی کر کے دوسرے شہروں کا رخ کرتے ہیں مگر ناصر علی اپنے راسخ مذہبی عقائد کے سبب اپنا ٹھکانہ نہیں چھوڑتے اور آخر کار طاعون کی شکل میں پھیلا ہوا مردم خور آسیب ختم ہو جاتا ہے۔ اسی دوران ذاکر کے خالو جو گوالیار میں ملازم تھے۔ انتقال کر جاتے ہیں تو اس کی خالہ اپنی دونوں بیٹیوں طاہرہ اور صابرہ کے ساتھ ان کے گھر آ جاتی ہیں۔ ذاکر کا سارا بچپن صابرہ کے ساتھ کھیلتے کودتے گزر جاتا ہے اور محبت کا معصوم نقش دونوں کے دلوں میں ابھرنے لگتا ہے۔ اسی اثنا میں ناصر علی جو کبھی روپ نگر کا کرتا دھرتا ہوا کرتے تھے، روپ نگر پر گرفت ڈھیلی پڑ جانے کی وجہ سے سفر کے لیے استخارہ کرتے ہیں اور روپ نگر سے ویاس پور اپنے بڑے بھائی خان بہادر کے گھر سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ روپ نگر صابرہ کے حوالے سے ذاکر کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے لیکن والد کے ایما پر اسے ویاس پور جانا پڑتا ہے۔

ویاس پور میں ذاکر کی ملاقات سریندر سے ہوتی ہے۔ بہت جلد ان کی دوستی ہو جاتی ہے۔ سریندر صابرہ کے حوالے سے ذاکر کا رازدان بن جاتا ہے۔ اس دوران ذاکر کو ایک بار پھر روپ نگر جانے کا اتفاق ہوتا ہے اور صابرہ کے ساتھ محبت شعوری کاوشوں کے سبب پروان چڑھنے لگتی ہے۔ ذاکر کی ویاس پور واپسی کے کچھ عرصے بعد صابرہ بھی ویاس پور آتی ہے اور وہ دونوں مستقبل کے سنہرے خواب بنتے ہیں۔

ویاس پور سے میٹرک کرنے کے بعد سریندر اور ذاکر مزید تعلیم کے حصول کے لیے میرٹھ آ جاتے ہیں۔ تقسیم سے قبل کی سیاسی فضا میں موجود گھٹن کا رنگ کالج میں پڑھنے والے طلباء کے پرجوش، لہجوں اور متشدد رویوں سے ابھرتا ہے۔ ذاکر ان پراگندہ حالات میں میرٹھ سے صابرہ کو ملنے روپ نگر جانا چاہتا ہے لیکن فسادات کی آگ کو بھڑکتا ہوا دیکھ کر سریندر ذاکر کو اپنے ساتھ ویاس پور لے آتا ہے۔ بکھری ہوئی اینٹوں اور ملبے کے ڈھیروں کو دیکھ کر دونوں کے دل بیٹھ جاتے ہیں کیوں کہ ان پر بخوبی یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ فسادات کی آنچ ان کے علاقے تک پہنچ گئی ہے۔ دونوں افسردہ خاطر اپنے اپنے محلے کی راہ لیتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے بعد لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہجرت کرنے لگتے ہیں۔ قتل و غارت

گری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ ہزاروں سالوں سے اکٹھے رہنے والے ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ بہو بیٹیوں کی عزتیں محفوظ نہیں رہتیں۔ ایسے میں ذاکر کا خاندان بھی منتشر ہو جاتا ہے۔ ذاکر کی خالہ زاد بہن صابرہ ہندوستان رہ جاتی ہے۔ دوسری بہن طاہرہ اپنی والدہ اور شوہر کے ساتھ ڈھاکہ منتقل ہو جاتی ہے۔ ذاکر اپنے والدین کے ساتھ پاکستان آ جاتا ہے اور لاہور میں مستقل سکونت اختیار کرتا ہے۔ لیکن سکون ناپید ہے قدرت کے کارخانے میں کے مصداق تقسیم کے بعد لوگوں کو مختلف مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

> ''زندگی کی ضرورتیں کہ ہجرت میں مختصر ہوتے ہوتے تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے تک محدود ہو گئی تھیں اب پھر بڑھ کر پھیل گئی تھیں اور بڑھتی پھیلتی چلی جا رہی تھی جن مکانوں نے کئی کئی خاندانوں کو پناہ دی اب وہ مکان باقی خاندانوں سے گلو خلاصی حاصل کر کے کسی ایک خاندان کی رہائش گاہ تھے..جن مکانوں میں ہنوز مختلف خاندان ٹھسے ہوئے تھے ان میں ہر خاندان اپنی ضروریات زندگی میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ پھیلنے کی کوشش کر رہا تھا.....پھر ایک کا ہاتھ اور دوسرے کا گریبان۔''(۱۸)

ملکی حالات کی بتدریج خرابی لوگوں کے لیے وبال بن جاتی ہے۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہوتی نظر آتی ہیں۔ وہ تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔ ان کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات جنم لیتے ہیں کہ آنے والا وقت کیا قیامت ڈھائے گا؟ ملک کا سیاسی اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟ مگر اس کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا کیوں کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن ماؤف ہو چکا ہے وہ کسی بات پر غور و فکر کرنا ہی نہیں چاہتے۔ انھی دگرگوں حالات میں ذاکر کو سریندر کا خط موصول ہوتا ہے جس میں وہ صابرہ کے حوالے سے ذاکر اور کسی حد تک ان تمام مسلمانوں پر گہرا طنز کرتا جو ہندوستان چھوڑ کر پاکستان آ گئے اور یہ بھول گئے کہ ان کے پیچھے رہ جانے والوں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو تن تنہا حوادث زمانہ کے تھپیڑے کھا رہے ہیں:

> ''اور ایک بات اور بتاؤں اور سب سے زیادہ اداس کر دینے والی بات یہی ہے۔ کل جب میں صابرہ کے ساتھ چائے پی رہا تھا تو میری نظر اس کی مانگ پر جا پڑی...میں نے دیکھا کہ کالے بالوں کے بیچ ایک بال چاندی کی طرح چمک رہا ہے تو اے میرے متر! سمے بیت رہا ہے۔ ہم سب سمے کی زد میں ہیں۔ تو بس جلدی کر اور آ جا۔ آ کر شہر دلی کو دیکھ اور شہر خوبی سے مل کہ دونوں تیرے انتظار میں ہیں آ اور مل اس سے پہلے کہ اس کی مانگ میں چاندی بھر جائے اور اس سے پہلے کہ تیرا سر برف کا گالا بن جائے اور ہم کہانی بن جائیں۔''(۱۹)

ذاکر کے چاہنے کے باوجود صابرہ ہندوستان چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتی اور روپ نگر کو چھوڑ کر دلی ریڈیو پر ملازمت کر لیتی ہے۔ ڈھاکہ میں اس بہن، بہنوئی اور والدہ مقیم ہیں۔ اس لیے وہ ڈھاکہ کے بارے میں تازہ ترین صورت حال جاننے کے لیے سریندر کے پاس جاتی ہے۔ صابرہ کی تنہائی کو دیکھ کر سریندر ذاکر سے کہتا ہے کہ

اسے آ کر لے جائے۔

ذاکر صابرہ کے حوالے سے سریندر کا خط پڑھ کر اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے مگر ملکی و سیاسی حالات کی ابتری اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ وہ صابرہ کو لینے نہیں جا سکتا۔ اس دوران اس کی زندگی میں تسنیم اور انیسہ نامی لڑکیاں آتی ہیں۔ تسنیم تو ہوا کے جھونکے کی مانند اسے چھو کر گزر جاتی ہے مگر وہ انیسہ کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ ایسے میں جنگ قیامت خیز ثابت ہوتی ہے۔ ذاکر اس کے حوالے سے اپنے خیالات و احساسات خوف و دہشت کے عالم میں اپنی ڈائری میں قلم بند کرتا جاتا ہے۔ حواس مختل کر دینے والے اِن روح فرسا لمحات میں ذاکر کو سریندر کا دوبارہ خط موصول ہوتا ہے جس میں وہ صابرہ کے حوالے سے اسے بے حس اور ظالم کہتا ہے کہ اب تک وہ صابرہ کی خیر خبر بھی دریافت نہیں کر سکا۔ ساتھ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ صابرہ جہاں پہلے ڈھاکہ سے آنے والی کسی خبر سے پریشان رہتی تھی۔ اب وہ لاہور کی خبروں پر زیادہ دھیان دیتی ہے اور اکثر رو بھی پڑتی ہے۔ خط پڑھنے کے بعد چند لمحوں کے لیے ذاکر پریشان رہتا ہے مگر حالات کی گھمبیرتا کی زنجیریں اسے بری طرح سے جکڑے رکھتی ہیں اور وہ صابرہ کی طرف توجہ نہیں دے پاتا ایسے میں ملک دولخت ہو جاتا ہے۔ اپنا انگ الگ جانے کی وجہ سے ہر شخص خون کے آنسو روتا نظر آتا ہے۔ معاشرتی فضا کی پژمردگی اور گھٹن میں اضافہ ہو جاتا ہے اور لوگ پریشانی و بدحواسی کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایسے میں ذاکر کے والد ناصر علی کا آخری وقت آن پہنچتا ہے۔ وہ روپ نگر کی حویلی کی چابیاں ذاکر کے حوالے کرتے ہیں۔ بقچے سے سجدہ گاہ اور تسبیح نکال کر اس کی ماں کو دیتے ہیں اور خود اپنے خالق حقیقی سے جا ملتے ہیں۔ والد کی ناگہانی موت ذاکر کے دل مضطرب کی بے چینی میں اضافہ کر دیتی ہے اور وہ پراگندہ ذہنی حالات کے سبب سارا سارا دن سڑکوں پر اِدھر اُدھر بے مقصد گھومتا ہے۔ اسے اپنی ذات کی بے چینی اور ذہنی پریشانی کا رنگ اس صورت نظر آتا ہے کہ بازاروں، سڑکوں، گلیوں میں چلتے پھرتے آتے جاتے لوگوں کے چہرے چپٹے معلوم ہوتے ہیں اور اپنی چال سمیت اسے دوسروں کی چال بھی بے ڈھنگی نظر آتی ہے۔ اسے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنی روح کے عذاب میں گھرا ہوا ہے۔ وہ اپنے عہد کے آشوب کو ماضی کے حوالے سے بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو ذہنی طور پر تاریخ کے مختلف واقعات اور سانحات میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ عہد نامہ عتیق، ہندو دیومالائی قصے، جاتک کہانیاں، واقعہ کربلا اور ۱۸۵۷ء کے حالات و واقعات سب اُس کی نظروں کے سامنے گھوم جاتے ہیں اور اسے تاریخ کے ہر عہد سے ناکام و نامراد لوٹنا پڑتا ہے۔ زندگی اس کے لیے ایک جبر کا روپ دھار لیتی ہے۔ والد کی قبر ٹھیک کرنے کے لیے ذاکر قبرستان کا رخ کرتا ہے تو وہاں اس کی ملاقات افضال اور عرفان سے ہوتی ہے۔ تینوں گرد و پیش کی مجموعی، قومی، سماجی اور سیاسی ابتری کو محسوس کرتے ہوئے پریشانی کے عالم میں حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ دورانِ گفتگو ذاکر عرفان کو مطلع کرتا ہے کہ اتنا وقت ضائع ہو جانے کے بعد بھی وہ ہندوستان سریندر کو صابرہ کے لیے خط لکھے گا۔ افضال دونوں کو خاموش کراتے ہوئے ''بشارت'' کی نوید دیتا ہے اور یوں یہ ناول رجائی رنگ لیے ہوئے اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین ''بستی''میں قدیم اساطیر کے آئینے میں نسل در نسل یادوں کو کریدا ہے اور پھر اسے زمانہ حال کے کرداروں کے توسط سے قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔اس طرح وہ روایت کا احیاء کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا روایت پر زور دینا ناسٹلجیائی رویہ نہیں ہے بلکہ روایت کے بطن سے مستقبل کی تعمیر کرتے دکھائی دیتے ہیں انھیں حال کا آشوب ماضی کے آشوب سے آمیز دکھائی دیتا ہے:

''کالے مندر سے کربلا تک،کربلا سے قلعے تک،قلعے سے راون بن تک اور سب کچھ اسی طرح تھا۔''(۲۰)

''شاکیہ منی نے جاتک سنائی،بھکشوؤں کو دیکھا،کہا کہ ہے بھکشوؤں!جانتے ہو وہ راج ہنس کون تھا؟وہ راج ہنس میں تھا۔''(۲۱)

ناول نگار نے ''بستی''میں خارجی رشتوں کی بجائے باطنی رشتوں کو ٹٹولا ہے۔یہ باطنی رشتے ماضی سے پیوست ہیں۔انھیں اس کا شدت سے احساس ہے کہ ان کی ذات کا کوئی حصہ کٹ کر ماضی میں کھو گیا ہے۔انھوں نے اسی کھوئی ہوئی ذات کو تخیل کی آنکھ سے واپس اسی ذات میں سمونے کی کوشش کی ہے جس سے اس کا تعلق ٹوٹا ہے۔یہ تعلق ہجرت کے باعث ٹوٹا تھا اس لیے ماضی کے اس حصے کو انھوں نے داستانوی اسلوب میں کھوجنے کی کوشش کی ہے۔ان کا یہ داستانوی اسلوب اساطیر،دیومالاؤں اور علامتوں سے مزین ہے۔جو عام فہم،سادہ اور جاندار ہے۔انتظار حسین نے اس ناول میں تہذیبی روایات کی بازیافت کی بھی کوشش کی ہے۔یہ قصہ ان لوگوں کی بازیافت ہے۔جو وقت کی آندھی میں بچھڑ جاتے ہیں۔یادداشت کے بل پر بھولے بسرے لوگوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے سے ایک گم شدہ دنیا اپنے پورے خدوخال کے ساتھ قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ہجرت کے باعث گم شدہ مقامات اور رشتوں کی کسک کو روپ نگر کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے:

''جیسے اس کا بچپن روپ نگر میں رہ گیا تھا روپ نگر میں کیا کچھ رہ گیا تھا۔کچے پکے رستے کہاں جا کر نکلتے تھے،بس درختوں میں گم ہوتے دکھائی دیتے تھے،ڈولتے ہچکولے کھاتے اکے،اونگھتی رینگتی بیل گاڑیاں،کوئی کوئی رتھ کہ اس میں جتے توانا بیلوں کی گردنوں میں گھنٹیوں اور گھنگھروں کی بدولت وہ مٹی میں اٹے رستے ایک میٹھے شور سے بھر جاتے تھے۔کالا مندر،کالے مندر کے احاطے میں کھڑا بندروں سے آباد بڑا پیپل،کربلا کی ویران اور اداس فصیل،ٹیلے والا قلعہ،راون بن،راون بن کے بیچ کھڑا بھید بھرا برگد،بس ایک پورا دیومالائی عہد جو روپ نگر کے ساتھ رہ گیا تھا۔''(۲۲)

انتظار حسین نے ناول میں ماچس کی ڈبیوں کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ان میں تیلیوں کا موجود نہ ہونا بستیوں میں مکینوں کے انخلاء کی علامت ہے۔مولوی دیا سلائی کے نام میں گہری رمزیت ہے۔دیا سلائی جل کر بجھ جاتی ہے۔مولوی بھی خاموش اور اپنے آپ میں گم ہے ماچس کی خالی ڈبیاں اپنے سامنے رکھ کر ان بستیوں کی بازیافت کی کوشش کرتا ہے جو ماچس کی طرح جل گئیں اور ان کے مکینوں کو ماچس کی تیلیوں کی طرح جلا دیا گیا۔اسی

طرح انتظار حسین نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بلیک آؤٹ کو افراد کے اعصاب پر سوار ہوتے ہوئے بھی دکھایا ہے۔ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے والے افراد جب ایک جگہ بیٹھتے ہیں تو انھیں اپنا گرد و پیش غار محسوس ہوتا ہے۔

''بستی'' کے تمام کردار متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذہنی پراگندگی اور تذبذب کی کیفیت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے وہ کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے افعال و اعمال پیچیدگیوں کے مظہر ہیں۔ ذاکر یو۔ پی کی بستی سے جذباتی لحاظ سے جڑا ہوا ہے۔ وہاں صابرہ ہے جو ذاکر کے لیے اپنے دل میں بے نام رشتہ لیے بیٹھی ہے۔ دونوں کی محبت غم ہجر کے تلخ جام پینے پر مجبور ہے۔ ناول کا آغاز تقسیم پاکستان کے بعد مہاجرین کے لیے جذبہ محبت لیے ہوئے ہوتا ہے جو بتدریج حرص و ہوس اور نفرت و کدورت کی نذر ہو جاتا ہے۔ مصنف نے اس ناول میں صورتِ واقعہ کی مناسبت سے جدید دور کے انسان کے ذہنی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی انتشار کی فن کارانہ عکاسی کی ہے اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے بحرانی دور کا عمدہ خاکہ پیش کیا ہے۔

''بستی'' میں پلاٹ کی معدومیت کا شدید احساس ہوتا ہے کیوں کہ اس میں ناول نگار کا موضوع کی پیش کش میں زیادہ انحصار داخلی تجربوں پر رہا ہے۔ اس لیے اس کے پلاٹ کا ایک پیچیدہ اور سمجھ نہ آنے والا سلسلہ پورے ناول میں نظر آتا ہے۔ روپ نگر، تقسیم، فسادات، ہجرت، پاکستان آمد کے حوالے سے تمام مناظر، واقعات اور زماں و مکاں میں کوئی ربط و ضبط موجود نہیں ہے۔ ناول نگار بات کہیں کی اور کسی اور زمانے کی کر رہا ہوتا ہے کہ بات کا رخ پھیرتے ہوئے کسی اور زمانے میں جا پہنچتا ہے۔ غرض یہ تکنیک کا ایسا پیچیدہ تنوع ہے جس نے پلاٹ کی حیثیت مشکوک بنا دی ہے۔

''بستی'' میں تکنیک کا اتنا تنوع ملتا ہے کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ناول اس مخصوص فارم میں لکھا گیا ہے۔ ناول کا بیشتر حصہ شعور کی رو کے دو اہم طریقوں سے بلاواسطہ داخلی کلام Direct Interior Monologue اور بالواسطہ داخلی کلام Indirect Interior Monologue کی صورت میں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ فلیش بیک، تلازمہ خیال، مونتاژ، خط اور ڈائری کی تکنیک کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔ انور سجاد رقم طراز ہیں:

> '' 'بستی' ایک طویل مونولاگ ہے شعور کی رو، اجتماعی لاشعور، فلیش بیک، حال اور آخری ابواب میں فلیش بیک فارورڈ بھی معروضی صورت حال کو دیومالا تاریخ اور حکایتوں کی وساطت سے سمجھنا، بیان کرنا کنکریٹ صورت حال سے گریز نہیں بلکہ ماضی کے ساتھ حال کا تسلسل قائم کر کے قاری کے ذہن پر نقش بنانے کا ایک کامیاب طریقہ ہے۔''(۲۳)

مجموعی طور پر ''بستی'' اسلوبیاتی اعتبار سے علامتی انداز کا حامل ناول ہے۔ انتظار حسین نے داستانوی علائم و رموز، تشبیہات و استعارات، علاقائی زبانیں، گیتوں اور بولیوں کے سہارے بستی کا تانا بانا بُننے کی کوشش کی ہے۔ دوہری ہجرتوں کا المیہ ایک جانب اور فرد کی ذات کی شکست و ریخت دوسری جانب علامتوں کے جال میں ''بستی'' کا روپ دھارتی ہے۔ یہ ناول انتظار حسین کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک ایسا شاہکار ہے جسے مدتوں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

تذکرہ (۱۹۸۷ء):

''تــــذ کـــــرہ'' کا بنیادی اور اہم موضوع ملکی سیاست کی ایک خاص پیش کش ہے جو جبریت اور تشدد کی عکاس ہے۔ انتظار حسین نے ضیاء الحق کے عہد کی سفاکی اور بے رحمی اور ان سے متعلقہ منفی رجحانات کو اس انداز سے اس ناول میں پیش کیا ہے کہ قاری کو اس دور کی سماجی و سیاسی فضا اور لوگوں کے انفرادی و اجتماعی رویوں سے آگاہی ہو سکے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

> ''اس ناول کا لاہور جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء دور کا لاہور ہے جس کے حالات و واقعات کی طرف بے شمار اشارے اس میں بکھرے پڑے ہیں البتہ اس دور کے سب سے الم ناک واقعے یعنی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کو خاص اہمیت دی گئی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس سے مصنف نے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہی پورے ناول کا حاصل کلام ہے۔'' (۲۴)

انتظار حسین نے شہر لاہور کی سیاسی فضا کو ملک کی مجموعی سیاسی فضا سے باہم آمیز کرتے ہوئے جن واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ وہ معنی اور مفاہیم کے اعتبار سے تمام جبری رویوں کے غماز ہیں۔ مثلاً اس ناول میں ایک طرف تو کیمپ جیل لاہور کے عقب میں لگی ہوئی سرِعام پھانسیاں نظر آتی ہیں۔ دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو کی موت اور شہر میں بم دھماکوں کے سبب پیدا ہونے والی خوف و ہراس سے بھرپور سراسیمہ فضا محسوس ہوتی ہے یوں لاہور حالات و واقعات کے اعتبار سے پوری ملک کا ترجمان بن جاتا ہے۔ بقول رضی عابدی:

> ''بھٹو کی پھانسی اور اس کے بعد لاہور جیل کے باہر سرعام پھانسیاں اور بموں کے دھماکے۔ ایک ایک بات کو بڑی صراحت سے بیان کیا گیا ہے اور بیان کی افسانویت کے باوجود یہ حقیقتیں پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔'' (۲۵)

انتظار حسین اس ناول میں زمانی اعتبار سے جنرل ضیاء الحق کے عہد کو ایک بڑے آشوب کی صورت میں اپنی تخلیقی گرفت میں لیتے ہیں۔ ان کا مقصد محض ایک زمانی ترتیب سے رونما ہونے والے مختلف واقعات کی دستاویزی پیشکش نہیں ہے بلکہ وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ کس طرح یہ واقعات انسانی زندگیوں پر انفرادی و اجتماعی حیثیت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے نتیجے میں کون کون سے نفسیاتی اور جذباتی عوامل جنم لیتے ہیں اور سیاسی، اخلاقی و تہذیبی صورت حال مشکوک اور زوال پذیر ہوتی ہے۔ شمیم حنفی رقم طراز ہیں:

> ''تذکرہ بھی ایک گہری سیاسی بصیرت کا ناول ہے۔ مگر ہر بڑے لکھنے والے کی طرح، تذکرہ میں بھی سیاسی واردات کے ادراک، تفہیم اور تاثر کی جو سطح ملتی ہے۔ وہ ایک پر پیچ انسانی سطح ہے۔ انتظار حسین کی انفرادیت کا اہم ترین زاویہ یہی یہ ہے کہ وہ ہر سیاسی تجربے کو اس کی واقعاتی سطح سے الگ کر کے ایک وسیع تر انسانی سطح تک لے جاتے ہیں۔ اس تجربے کو انتظار حسین ایک ایسی شکل

دیتے ہیں جس میں زبان دراز اور کھردرے قسم کے سیاسی عناصر دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان عناصر کی چھوٹ تو اس تجربے پر پڑتی رہتی ہے لیکن یہ عناصر نہ تو اس تجربے کی قیادت کرتے ہیں نہ اس پر حاوی نظر آتے ہیں۔'' (۲۶)

''تذکرہ'' کی کہانی اپنے مرکزی کردار اخلاق کے گرد گھومتی ہے۔ یوپی کے قصبے کا یہ رہائشی ہجرت کر کے اپنی ماں بوجان کے ساتھ لاہور آتا ہے تو ماضی کی یادیں اس کردار کو اپنا اسیر بنا لیتی ہیں۔ گھر کے پرانے کاغذات میں اسے اپنے اسلاف کی خاندانی روایات کا تذکرہ ملتا ہے۔ چراغ حویلی کے مکین پرانی جاگیردارانہ اقدار کے پاس دار نظر آتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ہر فرد تضادات کا شکار ہو چکا ہے اور نئے معاشرتی اصولوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لیکن وقت نے تمام سماجی قدروں کو تبدیل کر دیا ہے اور دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا احساس جنم لے چکا ہے جس کے آہنی شکنجے سے نہ کوئی کبھی بچ سکا ہے اور نہ بچ سکے گا:

''ان دو آنکھوں نے اس عمر میں کیا کیا کچھ دیکھ لیا۔ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھتی ہے۔ تیموری بساط کو لٹتے دیکھا جہاں آباد کو اجڑتے دیکھا۔ تایا حضور کو دار پر بلند دیکھا اور اہل جہان آباد نے زیر آسمان کیا کیا دیکھا۔ جس بادشاہ کو تخت شاہی پر لباس شاہانہ میں رونق افروز دیکھا تھا، اسی کی لاش جمنا کی تپتی ریت پر پڑی دیکھی۔ تایا حضور نے ایک روز یہ احوال بیان کی اور اتنا روئے کہ ریش مبارک ان کے آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ ایسا اثر ہوا کہ جینے سے جی سرد ہوا رنگ چہرے کا زرد ہوا۔ دنیا کے قصوں بکھیڑوں سے منہ موڑا....خانہ نشین ہو گئے مصلے پر بیٹھ گئے۔ طبیعت میں نہ شوخی رہی نہ خوشی کی رمق مزاج میں غم بس گیا تھا الم رچ گیا تھا۔'' (۲۷)

ہجرت کے بعد اخلاق کو رہائش کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔ لیکن وہ دوسرے لوگوں کی طرح الاٹمنٹ کے لیے غلط کلیم داخل نہیں کرواتا۔ اس لیے بوجان کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہنے لگتا ہے۔ لیکن اسے کرائے کے مکان راس نہیں آتے ایک کے بعد دوسرا بدلتا چلا جاتا ہے۔ شادی کے بعد بوجان کے ساتھ ساتھ اس کی بیوی زبیدہ بھی اپنا مکان بنانے پر اصرار کرتی ہے۔ خود اخلاق بھی اپنی ذہنی پراگندگی اور اکھڑے ہوئے مزاج کے سبب کرائے کے مکان کو بُرا سمجھنے لگتا ہے اور سنجیدگی سے اپنی چھت کے بارے میں سوچنے لگتا ہے اور آخر کار مصائب و آلام کا سامنا کرتے ہوئے اپنا چھوٹا سا مکان بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور اسے ''آشیانہ'' کا نام دیتا ہے۔ اس دوران ملک میں جمہوریت کی بساط الٹ جاتی ہے۔ سرعام سزاؤں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اخلاق کا گھر جیل کے قریب واقع ہوتا ہے تو آئے دن کی پھانسیاں اس کے لیے ذہنی کوفت کا باعث بن جاتی ہیں۔ ایسے میں ملک کے قرب و جوار سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ کھلے عام پھانسیوں کے مناظر دیکھنے کے لیے اُمڈ پڑتے ہیں۔ وہ لوگوں کی طرح سرعام مردوں کو تختۂ دار پر لٹکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے اس کی بے چینی و بے قراری میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک رات بے خوابی کے عالم میں وہ اپنے دادا جان مشتاق علی کا تذکرہ پڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے جہاں

اسے اپنے خاندان کے مختلف بزرگوں سے شخصی آگاہی ہوتی ہے وہاں اسے یہ بھی علم ہوتا ہے خاندان کے مختلف افراد کن کن مصائب و آلام کا شکار رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ہندو مسلم تہذیب کی رواداری خلوص سے بھرپور سنگم سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ وہ لوگوں کی اعلیٰ ظرفی کے مختلف نمونے اور شائستگی و مروت کے بھرپور مرقعے بھی اس تذکرے میں دیکھتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح پوری رات تذکرہ کی ورق گردانی میں گزر جاتی ہے۔

مکان کی تعمیر کے سلسلے میں مختلف بینکوں اور دوست احباب سے لیا گیا قرض اخلاق کی ذہنی پریشانی کو دوگنا کر دیتا ہے۔ وہ اس بوجھ تلے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے اور اسے ادا کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیتا ہے مگر ہر بار اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر نیلامی کے نوٹس اس کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔ وہ ذہنی آسودگی کے حصول کے لیے اپنے دادا جان مشتاق علی کا تذکرہ نکالتا ہے اور اس کی ورق گردانی میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس تذکرے میں قدیم ہندی قصوں اور بدھ جاتکوں کا ذکر مشتاق علی کے دوست پنڈت گنگا دت اور ان کے والد سوم دت کے حوالے سے ملتا ہے۔ ان تمام قصے کہانیوں کی تلخیص یہ ہے کہ دنیا ایک شمشان بھومی ہے کال کا چکر ہے اور امن و آتشی محض خواب ہے۔ غرض اس تذکرے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جو اخلاق کی ذہنی آسودگی کا سبب بن سکے۔ ایسے میں اسے ذکیہ احمد کا خیال آتا ہے، جس سے کچھ عرصہ پہلے اس کی فون پر دوستی ہو جاتی ہے مگر انھیں بالمشافہ ملاقات کا موقع کبھی نہیں ملتا۔ ایک روز دونوں ایک کافی ہاؤس میں ملنے کا قصد کرتے ہیں اور ملاقات پر دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کیوں کہ اس سے پہلے ان کی روز بس اسٹینڈ پر ملاقات ہوتی ہے۔ ذکیہ پریشانی کے عالم میں روز اخلاق سے وقت پوچھا کرتی ہے۔ ایک دوسرے کو سامنے پا کر دونوں کے جذبات و احساسات سرد پڑ جاتے ہیں۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذکیہ احمد اخلاق کے لیے ایک دیومالا بن جاتی ہے۔ وہ اس کی تلاش میں کافی دوڑ دھوپ کرتا ہے لیکن پھر اسے ذکیہ احمد سے نہ تو کبھی بات کا اور نہ ملاقات کا موقع مل سکتا ہے۔

اخلاق سکونِ قلب کے لیے دوستوں کی محفل میں جانا شروع کر دیتا ہے تو ایک صبح پورے شہر لاہور کے لیے خوف و دہشت کا پیغام لے کر آتی ہے۔ صبح سویرے شائع ہونے والا ضمیمہ اخلاق پر پژمردگی طاری کر دیتا ہے۔ اسے شہر کا ہر فرد سہما ہوا نظر آتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کی خبر سے ہر سمت ہُو کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے میں اخلاق اپنے دوستوں کی محفل میں جاتا ہے جہاں کچھ لمحوں کے لیے اس خبر پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ بعدازاں کرکٹ میچ کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اخلاق بھاری قدموں کے ساتھ گھر کی راہ لیتا ہے۔ وہ مختلف خدشات اور اوہام کا شکار ہو کر گھر میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے پھر وہ اپنے پردادا حکیم چراغ علی کا تذکرہ دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ تذکرہ میں تاریخ کے مختلف واقعات و سانحات اپنے تمام المیاتی تاثرات لیے سامنے آتے ہیں جن میں اورنگ زیب اور داراشکوہ سے کربنوامیہ کے ظلم تک کے مختلف واقعات شامل ہیں۔ غرض تذکرے میں شامل تمام واقعات سے تذکرہ نگار یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسان ظالم ہے اور ظلم و تعدی سے کام لیتا ہے:

''زمانہ ابلق ایام پر سوار بگٹٹ دوڑتا ہے۔ نیک و بد کو نہیں دیکھتا ہے۔ بلاتمیز سب کو روندتا ہے۔

موت کی گرم بازاری ہے۔ آج ہم کل تمھاری باری ہے۔ قصہ مختصر دنیائے دوں میں حالت سب کی زبوں ہے۔ رنگ گردوں پر دم دگرگوں ہے کبھی یوں ہے کبھی ووں ہے۔''(۲۸)

بہت سی راتوں کی طرح یہ رات بھی اخلاق پر بھاری گزرتی ہے۔ اس واقعے کے بعد اخلاق طرح طرح کے شکوک وشبہات کا شکار ہو جاتا ہے۔ دروازے پر ہلکی سی دستک سے بھی اس کے تن بدن میں خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے اس دوران زبیدہ فال نکلواتی ہے اور اخلاق سے کہتی ہے کہ ہمیں یہ گھر راس نہیں اسے بیچ دینا چاہیے۔ بوجان گھر بیچنے کی بہت مخالفت کرتی ہیں۔ ان کے خیال میں گھر زندگی میں ایک ہی مرتبہ بنتا ہے اور پھر نسلوں تک چلتا ہے۔ پراپرٹی ڈیلر کو مکان بیچنے کی خبر کی نہ جانے کس طرح بھنک پڑ جاتی ہے۔ وہ آئے دن گھر دیکھنے اور دکھانے کے لیے آ جاتا ہے۔ اس کا بوجان کی صحت پر بہت برا اثر پڑتا ہے کیوں کہ وہ ماضی پرست خاتون ہیں جن کے ذہن کے نہاں خانوں میں آج بھی چراغ حویلی کی یادیں تروتازہ ہیں۔ گھر تبدیل کرنے کی باتیں ان کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوتی ہیں اور وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکنے کے سبب دارِ فانی سے کوچ کر جاتی ہیں۔ بوجان کی وفات کے بعد اخلاق گھر بیچنے کا ارادہ ملتوی کر دیتا ہے کیوں کہ جب وہ تذکرے کے توسط سے اپنے آباؤ اجداد کی خاندانی روایات پر نگاہ دوڑاتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک کسی رہائش گاہ کو فروخت کرنا تہذیب وشائستگی اور وراثت کی نیلامی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ یوں اخلاق تذکرے کی ورق گردانی کے بعد بلا جھجک اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ وہ ''آشیانہ'' نہیں بیچے گا خواہ حالات کتنے ہی گھمبیر کیوں نہ ہوں۔ کچھ عرصہ بعد ملکی سیاست میں بڑے پیمانے پر ابتری پیدا ہو جاتی ہے۔ اخلاق کو ہر طرف افراتفری، بھگدڑ، بے ربطی اور وحشت کا سامان بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ شہر میں بم دھماکے اور لوگوں کی بدحواسی دیکھتے ہوئے ماضی کے مختلف ادوار میں جا پہنچتا ہے اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے آشوب کو ماضی میں رونما ہونے والے مختلف حالات وواقعات اور سانحات کے توسط سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے ماضی وحال دونوں مذہبی، سیاسی اور تاریخی حوالوں سے بھیانک اور سیاہ معلوم ہوتے ہیں۔ اسے اپنے چاروں جانب مایوسی اور پسپائیت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس طرح یہ ناول تاسف، دکھ اور قنوطیت کی کیفیت لیے اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد ''تذکرہ'' کو ''بستی'' سے بہتر اور بلند درجے کا ناول قرار دیتے ہیں:

"So in Tazkara it is different Intizar. He has not only come home he has also come of age. He has left the Jungle of his memories, though not entirely, and has started living in the present and his immediate surroundings. He has given a fine testimony of his endeavour to discover himself in the manner in the novel under review, captivating in style and technique distressing in substance and effect ultimate." ۲۹

''بستی'' کی طرح ''تذکرہ''، میں بھی ناول نگار نے موضوع کو جن فکری پس منظروں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں قدیم ہندی دیومالائی قصے، بدھ جاتک کہانیاں، شیعی عقائد، تاریخی واقعات اور آسمانی صحائف شامل ہیں۔ان تمام فکری پس منظروں میں جو چیز مشترک نظر آتی ہے۔اسے انسانی ظلم، زیادتی، حق کی فزوں طلبی اور دنیا کے انتشار و فساد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔مگر ''تذکرہ''، میں ہجرت ہمیں مختلف فکری ابعاد کی حامل نظر آتی ہے۔ان میں اپنی آبائی جگہوں کو چھوڑنے کا احساس، ماضی پرستی، جذباتی و نفسیاتی مسائل، رہائشی و الاٹمنٹ کے مسائل، سماجی و اخلاقی بے حسی، تہذیبی قدروں کی پامالی، وقت کا جبری تصور، فطرت سے انسان کی دوری، زمینی عقائد اور نئی انسانی زندگی کی معاشرتی نیرنگی قابل ذکر ہیں۔

''تذکرہ'' میں پلاٹ کی کوئی مربوط اور گتھی ہوئی شکل نظر نہیں آتی۔ناول نگار نے پلاٹ کی روایتی حیثیت سے انحراف کرتے ہوئے قصے کی تعمیر اور اس کی بنیاد فکری تجربوں پر رکھی ہے۔اس لیے وہ جب اور جہاں چاہتا ہے قاری کو زماں و مکاں کے باہمی ربط و تسلسل کے بغیر فکر و خیال کی مختلف دنیاؤں میں پہنچا دیتا ہے۔اس لیے پلاٹ کا پیکر مختلف تکنیکی فضاؤں میں تحلیل ہو کر رہ گیا ہے۔جہاں تک ناول کی تکنیک کا تعلق ہے۔وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین ''تذکرہ'' بیک وقت ناول بھی ہے اور ایک خاندان کی خودنوشت سوانح عمری بھی!
> سوانح عمری یوں کہ ہر زمانے میں اس خاندان کے کسی نہ کسی رکن نے اپنی ساری نسلی داستان قلم
> بند کی ہے۔''(۳۰)

مصنف نے اس ناول میں ''بستی'' کی طرح فلیش بیک، شعور کی رو، تلازم خیال، مونتاژ اور خود کلامی جیسی تکنیکوں کا استعمال کیا ہے۔جہاں تک اس کے اسلوب کا تعلق ہے اس کا اسلوب شگفتہ ہے اور ناسٹلجیائی رجحان کا حامل ہے اور اس میں ہندی سنسکرت اور فارسی الفاظ کی آمیزش موجود ہے۔

آگے سمندر ہے (۱۹۹۵ء):

انتظار حسین نے ناول کا آغاز احمد مشتاق کے اس شعر سے کیا ہے:

وہی گلشن ہے لیکن وقت کی رفتار تو دیکھو
کوئی طائر نہیں پچھلے برس کے آشیانوں میں

ناول کا موضوع کراچی کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے جس میں لالچ اور ہوس کا دور دورہ ہے۔عہد جدید کی مادیت پسند سوچ اس کے مکینوں کے دلوں میں گھر کر چکی ہے جس سے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔خود غرضی اور مفاد پرستی نے انسانی رشتوں اور قدروں کو پامال کر دیا ہے۔کراچی میں بسنے والے لوگ ہر رنگ، ہر نسل، ہر زبان اور ہر مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ان میں سے اکثریت ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کی ہے:

''میاں یہ شہر خصمی شہر ہے۔سندھی، پنجابی، بلوچ، پٹھان، مہاجر... یاروں نے یہ شہر بسایا ہے یا کھچڑی پکائی ہے....مہاجر کی کوئی ایک قسم تھوڑی ہے۔کوئی پورب کا، کوئی پچھّم کا، کوئی اتر سے آیا، کوئی دکن سے چلا سارے ہندوستان سے ندیاں بہتی شور کرتی آئیں اور سمندر میں آ کرمل گئیں...مگراس میں کہاں...یہی تو مصیبت ہے ہر ندی کہتی ہے میں سمندر ہوں۔''(۳۱)

کراچی مختلف فرقوں، زبانوں اور زبانوں کو پروان چڑھانے والا مادہ پرست شہر ہے۔اس میں ہر شخص اپنی نظریاتی اور گروہی وابستگی سے سمندر کی حیثیت کر لیتا ہے۔ جیلانی کامران ''آگے سمندر ہے'' کے موضوع کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"The novel is about Karachi, the first capital of Islamic Republic of Pakistan. The novel tells us a sad tale about this city which is called the city of seven husbands....these people did not migrate to an alien land, they had indeed migrated to their own homeland.....the country of their free vote in 1945. Intizar Hussain has very aptly described the Life of the variour segments of the Urdu speaking people in Karachi. These people live centrifugally and belong to one category; the people who are haunted by memory." ۳۲

لیکن انتظار حسین کی رائے جیلانی کامران سے کچھ مختلف ہے:

''ایک تو یہ کہ عام طور پر اس ناول کے حوالے سے یہ کہا جا رہا ہے کہ کراچی کے موضوع پر لکھا گیا ہے اچھا، مجھے اس سے تھوڑا سا اختلاف ہے کہ لوگوں نے زیادہ غور سے اس ناول کو نہیں پڑھا بلکہ سرسری پڑھا ہے....اس میں کراچی جو آتا ہے وہ ایک Symbolize فضا کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایک بات میں اپنے متعلق اپنی کہانیوں اور ناولوں کے متعلق کہہ چکا ہوں کہ میرا ایک مسئلہ رہا ہے کہ پورے Sub-continent میں مسلمانوں کا جو آشوب چل رہا ہے خواہ سن ۵۷ سے چل رہا ہے سن ۴۷ سے، تو وہ میرا مسئلہ شروع سے رہا ہے تو خواہ میں ایک شہر کے بارے میں لکھوں اور وہ Locale جو ہے وہ لاہور ہے... یا پھر Locale کراچی ہو وہ مسئلہ میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے کہ Sub-continent کا یہ آشوب کہاں جا کر ختم ہوگا۔''(۳۳)

''آگے سمندر ہے'' میں انتظار حسین نے اپنے مخصوص موضوع ہجرت اور جڑ سے کٹنے کے کرب کے ساتھ ساتھ مہاجرین کی ایک مخصوص سوچ کی عکاسی کی ہے۔اس میں بیان کردہ مسائل وہی ہیں جو اس سے پہلے کے

دونوں ناولوں میں موجود ہیں یعنی تقسیم کے نتیجے میں ہونے والی ہجرت، انتشار و بدامنی، فطرت اور وقت کی جبریت وغیرہ۔ "آگے سمندر ہے" کا پلاٹ بھی ڈھیلا ڈھالا ہے۔ہم ناول کے روایتی پلاٹ کے فنی مراحل آغاز، ارتقا، منتہیٰ، تنزل اور انجام کو ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں۔اس کی بڑی وجہ تکنیک کا وہ تنوع ہے جو مغرب سے اردو فکشن میں در آیا ہے۔اس ناول میں بھی مصنف نے شعور کی رو، بالواسطہ داخلی کلام، تلازمہ خیال اور خط کی تکنیک استعمال کی ہے اور ماضی کی تاریخ، اساطیر، استعاروں اور علامتوں کے حوالے سے پیش کی ہے۔فرق یہ ہے کہ اس میں رمزیت اور معنی خیزی بھی موجود ہے۔

بقول صفدر میر:

> "For one thing it is prehaps the first piece of fiction by Intizar Hussain which gives up his old passimistic groove and, like the hateful progressive make his main character depend on a posture of optimism.... Intazar Hussin's fiction of mohajirat is the use of myths of migration, sepration, loss of identity in Hindu, Buddhist and Islamic literature, folk love and history. It is at this level that we find Intazar Hussain at his most proficient and versatile capability" ۳۴

اس ناول میں انتظار حسین مسخ شدہ روایات کی تلاش میں ہیں وہ انسان کو دھرتی کے ساتھ جڑنے کا احساس دلاتے ہیں جس طرح درخت کو اپنے اصل مقام سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے بعد پانی اور زمین کی ساخت سے مطابقت میں وقت لگتا ہے اسی طرح ہجرت کے بعد انسانوں کو بھی نئی جگہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس طرح درخت سے پھل اور گھنا سایہ حاصل کرنے کے لیے اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔اس طرح انسان کی سوچ اور فکر کو نئے ماحول میں ڈھالنے کے لیے سازگار ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ایسا ماحول جہاں اخوت بھائی چارہ اور رواداری ہو۔ان خوبیوں کی وجہ سے سماج خود بخود بہتری کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔لیکن اس شہر میں بے اطمینانی اور افراتفری کا دور دورہ ہے۔انسان کے دل و دماغ پر تعصّبات، نفرت، فرقہ واریت اور ذات برادری کا قبضہ ہے۔ یہ شہر جو کبھی امن وسکون کا گہوارہ تھا اب دہشت گردی کا شکار ہے۔اس پر ہر طرف موت کے سائے منڈلا رہے ہیں۔بے قصور لوگوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔خوف اور دہشت کی فضا سے سارا ماحول افسردہ ہو چکا ہے۔اس گھٹن زدہ ماحول میں کھلے ذہن کا مالک مجو بھائی دہشت گردی کا نشانہ بن جاتا ہے۔وہ کردار جو لوگوں کے چہروں سے نقاب اتارتا ہے، تاریخی حوالوں اور طنزیہ فقروں سے ناول کو دلچسپ بناتا ہے۔وہ بھی اس شہر میں پھیلی ہوئی دہشت گردی کا شکار بن جاتا ہے۔

ناول کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ ناول میں زندگی کی بصیرت صرف مجو بھائی کے حوالے سے ہی سامنے آتی ہے۔ مجو بھائی نے لوگوں کی نفسیات، گفتگو، ذہنی کج روی کو معصومانہ اور احمقانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ مجو بھائی کا کردار لوگوں کی سوچ اور فکر پر گہرا طنز کرتا ہوا کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ وہ مختلف واقعات کو جن میں مرزا ہادی علی بدایونی کا مشاعرہ، اسلام پر لیکچر کے دوران بہاریوں کا مہاتما بدھ کے مجسمے کے حوالے سے کیا جانے والا طنز بڑی خوبصورتی سے بیان کرتا ہے۔ اسی طرح لکھنوی نازک مزاجی کے حوالے سے آقا حسین اور رفیق کے درمیان بیٹی اور بیٹے کا رشتہ طے نہ ہونا بھی کھلی حقیقت ہے۔

انتظار حسین اپنے اس ناول میں بہت سے گھمبیر مسائل کو سامنے لاتے ہیں اور در پردہ مخفی اشاروں کنایوں میں یہ وضاحت بھی کر دیتے ہیں کہ اجتماعی انسانی زبوں حالی اور پریشانی سے چھٹکارا کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ''آگے سمندر ہے''کو اردو ناول نگاری کی تاریخ میں ایک معتبر اضافہ کہا جائے تو بے نہ ہوگا۔

حوالہ جات:

۱۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری اردو ناول کی تاریخ و تنقید، (لاہور: مکتبہ میری، ۱۹۶۶ء)، ص:۳۸۱

۲۔ انتظار حسین، چاند گہن، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء)، ص:۸۶

۳۔ ایضاً، ص:۵۲

۴۔ ایضاً، ص:۵۱

۵۔ ایضاً، ص:۸۸

۶۔ ایضاً، ص:۸۷

۷۔ ایضاً، ص:۷۷

۸۔ ارتضیٰ کریم (مرتب)، انتظار حسین – ایک دبستان، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء)، ص:۱۴۴

۹۔ انتظار حسین، چاند گہن، ص:۲۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۵۷

۱۱۔ ایضاً، ص:۸۴

۱۲۔ ایضاً، ص:۴۳

۱۳۔ ایضاً، ص:۳۳۱، ۳۳۲

۱۴۔ انتظار حسین، چاند گہن، ص:۲۵
۱۵۔ ارتضٰی کریم (مرتب)انتظار حسین – ایک دبستان، ص:۶۳
۱۶۔ ارتضٰی کریم (مرتب)،انتظار حسین – ایک دبستان، ص:۴۲۶
۱۷۔ ارتضٰی کریم (مرتب)،انتظار حسین – ایک دبستان، ص:۳۶۳
۱۸۔ انتظار حسین، بستی، (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۴ء)،ص:۹۵
۱۹۔ ایضاً،ص:۱۴۵
۲۰۔ ایضاً،ص:۷۶
۲۱۔ ایضاً،ص:۱۴۵
۲۲۔ ایضاً،ص:۷۸،۷۹
۲۳۔ ارتضٰی کریم (مرتب)،انتظار حسین – ایک دبستان، ص:۴۰۵
۲۴۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، اشارات، (کراچی: مکتبہ دانیال،۱۹۹۴ء)،ص:۲۱۵
۲۵۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، (لاہور: پولیمر پبلی کیشنز،۱۹۹۴ء)،ص:۱۰۷
۲۶۔ ارتضٰی کریم (مرتب)،انتظار حسین – ایک دبستان، ص:۴۳۹،۴۴۰
۲۷۔ انتظار حسین، تذکرہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۷ء)،ص:۱۸۷
۲۸۔ ایضاً

۲۹۔ Aftab Ahmed, Doctor, "Intazar Hussain Comes of Age" *Dawn* (Daily), Karachi, Friday 28, August 1987, Pg 13.

۳۰۔ ارتضٰی کریم (مرتب)،انتظار حسین – ایک دبستان، ص:۴۲۸
۳۱۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، (لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۰ء)،ص:۳۹

۳۲۔ Gillani Kamran, *Beyond lies the sea*, "The Frontier Post" (Lahore & Peshawar), Thursday, August 10, 1995, Pg 7.

۳۳۔ انتظار حسین سے سہیل ممتاز کی گفتگو، ۲۷ راگست ۱۹۹۶ء، مشمولہ انتظار حسین کی ناول نگاری – ایک جائزہ، مقالہ، ایم-اے، (لاہور: اورینٹل کالج جامعہ پنجاب،۱۹۹۶ء)، ص:۳۶۲

۳۴۔ Zeno, Intazar's Fiction of Migration , *Dawn* (Karachi) Friday, Sep 15, 1995.

ماخذ:

۱۔ ارتضیٰ کریم (مرتب)، انتظار حسین – ایک دبستان، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۶ء۔

۲۔ انتظار حسین، آگے سمندر ہے، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔

۳۔ انتظار حسین، بستی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

۴۔ انتظار حسین، تذکرہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء۔

۵۔ انتظار حسین، چاند گہن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء۔

۶۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر، اشارات، کراچی: مکتبہ دانیال، ۱۹۹۴ء۔

۷۔ رضی عابدی، تین ناول نگار، لاہور: پولیمر پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

۸۔ سہیل بخاری، ڈاکٹر، ناول نگاری اردو ناول کی تاریخ و تنقید، لاہور: مکتبہ میری، ۱۹۶۶ء۔

☆☆☆